

حضرت سید احمد شہید کی تحریک اصلاح و جہاد
اور

اس کے عمیق و وسیع اثرات

— اور —

مؤرخ کبیر و فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی

تاشر
↓

داعفات دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

باناؤل

۱۴۱۱ھ۔ جنوری ۱۹۹۱ء

نام کتاب _____ سید احمد شہید اور ان کی

تحریک اصلاح و جہاد

مصنف _____ پروفیسر سابق احمد نظامی

صفحات _____ ۲۲۲

تعداد _____ ۲۰۰۰

کتابت _____ حامد بستوی

طباعت _____ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس (آفسٹ)

قیمت _____

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

پیش لفظ

سید محمد رابع حسنی ندوی

مجاہد کبیر امیر المؤمنین حضرت سید احمد بن عرفان الشہید رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت
 اں بڑے بزرگ ہندو پاک کے لیے ایسی عظیم شخصیت گذری ہے جس نے اصلاح عقائد، تربیت
 باطنی، اعمال کلمۃ الحق اور حج و جہاد جیسے اسلامی زندگی کے پر عزیز ہمت کاموں کو نہ صرف
 قائم کیا بلکہ ان کو ان کے معیاری سطح پر جاری کیا، اور انفرادی دائرہ سے نکل کر اجتماعی اور
 امت کے دائرہ میں پوری طرح نافذ کرنے کی کوشش کی، چنانچہ ان کے ذریعہ اصلاح
 عقائد اور تربیت باطن کا جو عظیم کارنامہ انجام پایا، اس کے اثرات آج ان کی شہادۂ
 ڈیڑھ سو سال سے زیادہ گذر جانے پر بھی جگہ جگہ پائے جاتے ہیں جو اپنی فلاح و اصلاح
 کا سلسلہ نسب حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے مربوط جلتے اور ملتے ہیں،
 اور یہ اس ہمت پر سزا ہے کہ ہزاروں افراد کے داخل اسلام ہونے اور لاکھوں افراد کے

تعلق باللہ، توبہ و انابت، ترقی روحانی، توفیق شب بیداری اور ذوقِ دعا و مناجات کے حصول کا شرف حضرت سید احمد شہید اور ان کے مقربین کی کوششوں کو حاصل رہا، مشرقیہ و مغربی بنگال اور نیپال تک ان کی نورانی کوششوں کے اثرات پہنچے اور وسط و شمال ہند کے بیشتر روحانی و تعلیمی مراکز اپنا روحانی سلسلہ نسب حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت و دعوت سے ملاتے ہیں،

حج خطہ سے پُر ایسا رکن اسلام سمجھ لیا گیا تھا جو عدم استطاعت کے عذر کے تحت متروک ہونے لگا تھا، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بانگِ دہل عدم استطاعت کے عذر کو بے قیمت ثابت کیا، اور ایک مجمع کثیر (تقریباً سات سو افراد کے ساتھ) اس کو ادا کیا، جہاد جو مسلمانوں کی صرف کسی طاقت و حکومت کا ہی فریضہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا تھا، اور کسی باہمت حکومت کے نہ ہونے کی صورت میں ہر ایک شخص نے اپنے کو اس سے مستثنیٰ سمجھ لیا تھا، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اس کی طرف توجہ کی بلکہ اپنے حلقہٴ منتسبین کو اور جن افراد کو اس کے لیے آمادہ کر سکے، باقاعدہ اس کی تیاری کرائی اور پھر اس عظیم اسلامی عمل کو، جس کے بابے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ ”جو اس طرح دنیا سے گیا کہ نہ اس نے جہاد کیا نہ اس کو جہاد میں شرکت کی خواہش ہوئی، وہ جاہلیت کی موت مرا“ صرف انجام نہیں دیا بلکہ اس کو ”کتاب و سنت“ سے ماخوذ طریقہ کے مطابق جاری کیا اس میں ”کتاب و سنت“ کے مقررہ طریقہ سے انجام دینے میں بعض بڑے دنیاوی فوائد سے محروم ہونے کی صورت پیش آئی تو اس کو برداشت کیا لیکن اس عظیم اسلامی عمل کو

اس کے جادہ حق سے ہٹنے نہیں دیا،

آج نہ معلوم کتنی متنوع ذہنی و اسلامی برکات ہیں جو برصغیر کی ملت اسلامیہ کو
اسی تحریک و جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہیں، جن کا ہم کو پورا احساس نہیں ہوتا، ضرورت
یہ ہے کہ حضرت سید شہیدؒ کی دعوتی و اصلاحی کوششوں کو سمجھا جائے اور ان کے جو اجسزا
موجودہ امت اسلامیہ ہند کے حالات کے مطابق ہوں، ان کو اختیار کیا جائے، اس کے
لیے حضرت سید شہیدؒ کی حیات اور کارناموں کو جاننے کی ضرورت ہے،

حضرت سید شہیدؒ کی حیات اور کارناموں پر اردو میں کئی مفید اور عظیم کتب شائع
ہو چکی ہیں، ان میں سے وسیع تحقیقی و مفصل کتاب مولانا غلام رسول ہنزہ کی ہے، اور
دوسری مفصل اور مؤثر کتاب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی کی ہے، ان
کتابوں سے حضرت سید شہیدؒ کے کارناموں اور حالات کو جاننے کے ساتھ ان کے فکر و
عمل کے مزاج و روح کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے،

سالِ روہی ۱۹۷۷ء ماہ نومبر میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی طرف سے مولانا سید
محمد ثانی تعلیمی سوسائٹی کے انتظام و ضیافت میں، حضرت سید شہیدؒ ہی کے وطن
رائے بریل میں (جہاں ان کی تحریک اصلاح و جہاد کی تیاری ہوئی تھی) ”حمد و مناجات“
کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا، جس میں ملک کے طول و عرض سے فضلاء، اہل علم
نے شرکت کی، اور حجاز و نجد سے بھی چند ادباء و اہل علم شرکت کے لیے تشریف لائے،
ان شرکاء میں برصغیر کے مستند و عظیم مؤرخ و محقق پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی تھے، پروفیسر

موصوف کو اسلامی ہند کی تاریخ اور اس موضوع پر تحقیق اور بحث و نظر کا جو مقام حاصل ہے وہ کسی پڑھے لکھے شخص سے مخفی نہیں، اس کے ساتھ ساتھ پروفیسر صاحب کو ہندوستان کے عظیم مصلحوں اور مرتبوں سے عقیدت و محبت کا تعلق بھی ہے، اور وہ مشہور مرتبہ جانی و امام طریقت سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا سے انتساب رکھتے ہیں، پروفیسر صاحب کو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی سے ایک خاص ربط و تعلق ہے، اس کی بنا پر مولانا مدظلہ العالی نے پروفیسر صاحب سے فرمائش کی تھی کہ سیمینار کا موضوع ”حمد و مناجات“ ہے اور وہ موضوع اور جگہ کے لحاظ سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذوق دینی اور عمل سے خصوصی تعلق رکھتا ہے، پروفیسر صاحب برصغیر کی دینی شخصیتوں کی تاریخ سے خصوصی دل چسپی رکھتے ہیں، اس لیے وہ اس موقع پر اپنے قیمتی مقالہ کا موضوع انہی کو بنائیں، پروفیسر صاحب کی بھی ایک عرصہ سے حضرت سید شہیدؒ کے کام و مقام کو موضوع بنانے کی نیت تھی، لہذا انھوں نے نحوشی اس فرمائش کو نہ صرف قبول کیا بلکہ ایک دقیق مقالہ سپرد قلم کیا، جس میں علمی متانت، وسعت مطالعہ، تازہ نئی شواہد اور تاریخ و ادب کی شگفتگی کا ان کا انداز نگارش پوری طرح نمایاں ہے، برجستہ و بروقع اشعار اور کلام اقبال نے اس کی تاثیر و حملاوت میں مزید اضافہ کیا ہے، جس کی بنا پر وہیں ایک علمی و تاریخی مقالہ نہیں ہے، بلکہ ادب اسلامی کا بھی ایک دقیق تحفہ ہے، موضوع کی اہمیت اور مقالہ کی وقعت و افادیت کے پیش نظر یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس کو علاحدہ سے ایک علمی رسالہ کے طور پر شائع کیا جائے، اسے

ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے، حضرت سید شہد کے وطن کے ہی ایک علمی ادارہ
 ”دار عفتارت“ نے آمادگی ظاہر کی، چنانچہ یہ رسالہ دار عفتارت کی طرف سے
 اور رابطہ ادب اسلامی کے تعاون سے شائع کیا جا رہا ہے،
 اس طرح دونوں متعلق اداروں کی شرکت ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ اس عمل
 کو مفید بنائے اور مقبول فرمائے، آمین

محمد راجح حسینی ندوی

”دار عفتارت“ رائے بریلی

۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ - ۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حمد و صلوة کے بعد اس حقیقت کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ایک مدت سے راقم کو رائے بریل حاضری کی تمنا تھی کہ اس فضا میں کچھ دیڑھ سانس لینے کی سعادت میسر آئے جہاں حکمت ولی اللہی اور سوز علم الہی نے مل کر نیا پیکر اختیار کیا تھا، اور جہاں سرفروشی اور جان سپاری کی تاریخ لکھی گئی تھی۔ رائے بریل کو قدرت نے امتیازی خصوصیات سے نوازا ہے۔ یہ صدیوں سے علم و ارشاد کا گہوارہ، شریعت و سنت نبوی کا مرکز، اور دعوت و عزیمت کا منبع ہے۔ جس فیض کی ابتدا شاہ علم اللہ کی نوائے سحری، سید احمد شہید کے ذوق شہادت اور مولانا حکیم سید عبدالحی کے تبحر علمی سے ہوئی تھی وہ آج مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی ذات گرامی میں ایک نئی قوت بن کر نمودار ہوا ہے۔

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر

کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

زمانے نے کروٹ بدلی ہے اور جہاد باسیف کی جگہ جہاد بالقلم نے

لے لی ہے۔ اور حضرت علی میاں نے اپنی زبان اور قلم سے جس طرح اسلام کی خدمت

کی ہے اس سے تاریخ دعوت و عزیمت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی قیادت میں حکمت ولی اللہی ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے

ظ آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

ان کی ذات میں عشق، علم اور عمل تینوں کا اجتماع ہے ۷

ضمیر امتاں رومی کند پاک

کلمے یا حکیمے نے نوازے

سید احمد شہید کے وطن میں حاضری ایک سعادت ہے۔ جیسا کہ ہوں کہ

”سرخاک شہیدان“ کیا نثار کروں کہ میرا دامن علم و عمل کی دولت سے خالی ہے

ظ مگر میں نذر کو ایک آگینہ لایا ہوں

یہ آگینہ میرا دل ہے جو سید شہید کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور احوالِ امتی کے لیے

شبانہ روز کو ششوں کے احسان کی گراں باری آج بھی محسوس کر رہا ہے ۷

سوز دل، اشک رواں، آہ سحر، نالہ شب

ایں ہمہ از اثر لطف شمامی بنیم !

(۲)

اسلام کی دینی فکر اور سماجی زندگی کا مرکزی نقطہ توحید ہے۔ بقول اقبال

پہی دین محکم، پہی فتح باب

کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

انفرادی زندگی ہو یا حیات اجتماعی، جب یہ عقیدہ قلوب انسانی میں جاگزیں ہو کر احساس و شعور پر اثر انداز ہوتا ہے تو طلسم رنگ و بو ٹوٹ جاتا ہے اور انسانی زندگی میں توانائی کی نئی لہر، عزائم میں نیا دلولہ اور نظر میں نئی تابندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مالک حقیقی کے سامنے اس کا ایک سجدہ جو اس کو ہزاروں سجدوں سے نجات دلاتا ہے، ملت کے لیے زندگی کا پیام ہوتا ہے۔ وہ رب کائنات سے اپنا رشتہ جوڑ کر تخلیق کائنات کا مقصد پورا کرتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی میں توجید کی اس زندہ حقیقت کا احساس جب بھی کمزور پڑا، تو وہی کیفیت ہو گئی کہ

عظمت گئی جس دم تڑپ، سیلاب سیم خام ہے

سید احمد شہید نے مسلمانوں کی تاریخ کے ایک دور ابتلاء و انتشار میں "توحید"

کا یہ تصور اجاگر کرنے میں اپنی زندگی قربان کی تھی اور بتایا تھا کہ

اے لاکھ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں

گفتار دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ

خود ان کی زندگی "گفتار دلبرانہ" اور کردارِ قاہرانہ کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔

دہ کل ۴۶ سال (۱۸۳۱ء - ۱۸۷۶ء) اس جہاں فانی میں رہے۔ اس مختصر مدت میں احیاء

ملت کے لیے جو جدوجہد و سہی کی وہ تاریخ بھلا نہیں سکتی۔ ان کی زندگی کا ۳۲ واں سال

مقاجب انہوں نے اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ اور اپنی "گفتار دلبرانہ" سے دینی احساس

و شعور کو بیدار کرنے۔ اور اسلام کے اس نظام حیات کو سمجھانے میں جو صرف عقیدہ

”توحید“ کے گرد نشوونما پاسکتا ہے، چار سال شب و روز جدوجہد کرتے رہے۔ پھر ۱۸۲۱ء میں میدان عمل میں سر بکف داخل ہوئے، اور ”کردار قاہرانہ“ کا جیتا جاگتا نمونہ بن گئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا آفتاب علم و ارشاد غروب ہوا چاہتا تھا کہ ”سادات قطبی ساکن رائے بریلی کا ایک بزرگ زادہ“ ان کی خدمت میں پہنچا۔ ان کی بورہ صحت بڑیاں جس غم میں پگھلی جاتی تھیں اس کا درمان پیدا ہو گیا۔ ان کے فتوے کو عمل جامہ پہنانے کے اسباب مہیا ہو گئے اور انھوں نے محسوس کیا

آمد آں یارے کہ مائی خواستیم

اس احساس نے کہ حکمت ولی الہی کو کردار و عمل میں منتقل کرنے والا عالم وجود میں آگیا ان کی شمع زندگی میں نئی روشنی پیدا کر دی۔ اپنی مجلسوں میں ان کی ”قوی نسبت مجددی“ دوسروں کو متاثر کرنے کی غیر معمولی قوت، اور بے حد ذکی القلب ہونے کا ذکر بڑے جذبے سے کیا (ملفوظات ص ۲۷، ۵)، ادھر خاندان ولی الہی کی عظیم المرتبت شخصیتیں جنہوں نے ”حضرات ثلاثہ“ کی صحبت میں تربیت پائی تھی، ان کے جھنڈے کے نیچے اس طرح جمع ہو گئیں گویا ان کے انتظار میں چشم براہ تھیں۔

تو نخل خوش شمر کیستی ؟ کہ باغ و چمن
ہم ز خویش بریدند و در تو پیوستند

ان حضرات کا سید شہید کے دامن تربیت سے وابستہ ہونا، اعلان تھا اس بات کا کہ اب حکمت ولی الہی کا نیا دوران کی قیادت میں شروع ہو گا۔ شاد عبدالعزیز کے

نواسے مولانا محمد یعقوب کا بیان ہے کہ:-

”شاہ عبدالعزیزؒ کی توجہ کی تاثیر مثل ہلکے سے مینھ کے ہوتی ہے جس کی چھوٹی چھوٹی بوندیں ہوتی ہیں، لیکن سید صاحب کی تاثیر مثل لوہاروں کی پھکنی کے اثر کرتی ہے جو توارہ کی طرح قلب پر پڑتی ہے“
(سوانح احمدی، جعفر نقانیری ص ۴۱)

یہ فرق تھا ایک معلم اور ایک مجاہد کے انداز فکر و عمل کا۔ تجدید و تدوین علوم کا کام ختم ہو چکا تھا، جہاد و عمل کا میدان کھل گیا تھا۔ مسند درس کی جگہ اب میدان کارزار نے لے لی تھی۔ اس کے مرد میدان سید شہید تھے

بدن اس تازہ جہاں کا ہے اس کی کف خاک
روح اس تازہ جہاں کی ہے اس کی تبکیر

(۳)

سید احمد شہید نے جس زمین میں آنکھ کھولی اور جس روح پر و فضا میں تربیت پائی تھی وہ پھلت کی طرح ”قریۃ الصالحین“ تھا۔ یہاں شاہ علم اللہ نے اتباع سنت کی وہ عظیم الشان روایت قائم کی تھی، جس سے اورنگ زیب عالمگیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ سکا تھا۔ شاہ غلام علی دہلوی کے ملفوظات ”دُرّ المعارف“ میں ہے کہ اورنگ زیب نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر عمار نے یہ بتائی کہ سنت نبویؐ کا کوئی زبردست اتباع کرنے والا دنیائے فانی سے رخصت ہوا۔ اس رات شاہ علم اللہ نے وصال فرمایا۔

شاہ علم اللہؒ نے جب رائے بریلی میں اپنا رخت سفر کھولا اور قیام کا فیصلہ کیا تو یہاں کی دینی زندگی میں حرارت پیدا ہو گئی اور یہاں کے بامِ دہر تکبیر و اذان کی صداؤں سے گونج اٹھے۔ رفتہ رفتہ رائے بریلی حضرت مجدد صاحب اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ دونوں کی علمی، دینی، اور اصلاحی تحریکوں کا مزج بن گیا۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید ع

چشمہ و پرویں ہے اس خاک سے روشن

حضرت مجدد صاحب کے خلیفہ حضرت شاہ آدم نور محمدؒ سے حضرت شاہ علم اللہؒ نے بیعت کی، اور ان سے خلافت اس بشارت کے ساتھ پائی کہ تمہاری حیثیت ستاروں میں آفتاب کی ہوگی۔ سید شہید کے نانا شاہ ابوسعید حسنیؒ نے شاہ ولی اللہؒ سے کسب فیض کیا۔ ان کے متعلق شاہ ولی اللہؒ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”اِس راہ کہ میروند ہما طریق مستقیم است“

خطوط سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان ولی اللہؒ اور خاندان علم اللہؒ میں گہرا ارتباط اور تعلق تھا۔ دونوں گھرانوں کی خواتین کے بھی آپس میں مراسم تھے۔ شاہ ابوسعیدؒ نے مالی مشکلات میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مدد کی تھی۔ شاہ ولی اللہؒ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”چنانچہ اِس نیاز مند را از فکر معاش نجات بخشیدند، اُو جمل علما از جمیع حاجات از دین و دنیا ذات سالی را خلاص و نجات عنایت فرماید“

شاہ ابوسعید، شاہ اہل اللہ، شاہ ابواللیث حسنی، شاہ محمد عاشق شاہ
عبدالعزیز کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ چنانچہ جس سرزمین میں
سید احمد شہید نے آنکھ کھولی، وہاں احیاء ملت کی تحریکوں کا دل دھڑک رہا تھا۔

(۴)

حضرت شاہ ولی اللہ نے تفسیحات الہیہ میں ایک جگہ اشارہ کیا ہے کہ اگر
موقع و محل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کر کے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت اور صلاحیت
رکھتا تھا (جلد اول ص ۱۰۱) حالات کا یہ تقاضا نہ تھا اس لیے وہ خاموش رہے۔ گو
”فکٹ کُل نظام“ کی صدائیں ان کی مسند درس سے بلند ہوتی رہیں (فیوض الحرمین) کچھ
عرصہ بعد جب حالات نے ایک مجاہد کو پکارا تو سید احمد شہید نے لبیک کہا اور ان ہی کے
گرد و خاندان ولی اللہی کے بہترین دماغ جمع ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کی
دین اور اصلاحی تحریک سید احمد شہید کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچی۔

عمر باد رکعبہ و بت خانہ می نالہ حیات

تا بزعم عشق یک دانائے راز آید بروں

سید احمد شہید کی تحریک کامرکز و محور یہ اعتقاد تھا کہ توحید خالص کی حقیقی روح

اگر مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں واپس آجائے تو پھر ان کی زندگی کا نقشہ
بدل جائے۔ ہندوستان کی تاریخ میں توحید کی سر بلندی کے لیے عملی میدان میں جدو
جہد کی اس سے بڑھ کر کوئی دوسری تحریک منصفہ شہود پر نہیں آئی

اس بنیادی مقصد کے حصول کے لیے سید شہید نے تین چیزوں پر زور دیا۔

احیاء سنت

امامت بدعت

تملیقین جہاد

صحیح اسلامی روح بیدار کرنے کے لیے ضروری تھا کہ بدعات کا خاتمہ کیا جائے

اور زندگی کے ہر شعبہ میں سنت نبوی کے اتباع کا جذبہ ابھارا جائے۔ عقائد کی اصلاح اور سماجی خرابیوں کا ازالہ، احیاء امت کے لیے از بس ضروری تھا پھر سیاسی اقتدار کو غیر ملکی ہاتھوں سے نکلانے کے لیے جہاد کی روح بھونکنا وقت کا سب سے بڑا تقاضا تھا۔

اسلام کی دینی فکر میں جہاد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ احیاء امت کے

لیے یہ نسخہ اللہ کے صرف وہ بندے استعمال کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنے لیے جینا چھوڑ دیا ہو اور جن کی زندگی اور موت اپنے رب کے لیے ہو۔ عزم جہاد کرنے والے کو پہلے اپنے نفس

سے جہاد پر کر بستی ہونا پڑتا ہے۔ خواجہ محمد معصوم نے شاہزادہ اورنگ زیب کے نام ایک

خط میں جہاد کی اس اہمیت پر بڑے دلنشین انداز میں گفتگو کی ہے۔ ہندوستان

میں اللہ کی راہ میں جہاد کی تملیقین اور اس پر عمل کی سعادت سید شہید کے لیے مُقَدَّر تھی۔

انہوں نے اس تصور کو اس طرح مسلمانوں کے ذہن و دل پر نقش کر دیا کہ مدتوں تک انگریز

مُذَبِّرین اور مصتفین کی کوششیں اس تصور کو ذہن سے مٹانے میں صرف ہوئیں اور ان ہی کے

زیر اثر بعض علماء اور دانش وروں نے جہاد کو غیر اسلامی بتانے میں اپنی علمی صلاحیتیں

استعمال کیں۔

اقبال نے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ایک میٹر کی زبان سے کہلوایا ہے ۔

کس کی نویدری پہ حجت ہے یہ فرمان جدید

ہے جہاد اس دور میں مرد مسلمان پر حرام

فری لینڈ ایبٹ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ قرون وسطیٰ کے وہ حالات جو

جہاد کو کامیاب بنانے کا باعث تھے، سید احمد شہید کے زمانہ میں نہیں رہے تھے۔ گویا

یہ بے وقت کی صدائق جو انہوں نے بلند کی (THE MUSLIM WORLD, JULY 1962)

لیکن یہ خیال جہاد کی حقیقی نوعیت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اور اسی انداز فکر کا ترجمان

ہے جو مستشرقین نے عموماً سید احمد شہید کی تحریک کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے۔

برطانوی اقدار کی طرف سے تصور جہاد کو مٹانے کی کوششیں ایک طرف

پورے زور و شور سے جاری تھیں، دوسری طرف منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی

کی فتوح الشام (واقوی) کا منظوم ترجمہ مصاصم الاسلام کے نام لکھ کر اس تصور کو

زندہ رکھنے کی جہدوں جاری تھی۔ سید شہید کے بعد تصور جہاد پر مختلف زاویہ ہائے

نظر سے جو لکھا گیا ہے۔ اس کا تجزیہ بعض تاریخی حقائق کا پس منظر سمجھنے کے لیے از بس

ضروری ہے۔ روح اسلامی کو مجرد کرنے کے لیے جہاد کے تصور کو مسلمانوں کے

مذہب احساس و شور سے نکالا گیا تھا۔

اسلامی تاریخ کے وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ عشق، علم اور عمل — ان تین قوتوں نے اکثر مل کر اور کبھی کبھی علیحدہ علیحدہ مسلمانوں کی جیتا اجتماعی کوتوانائی بخشی ہے۔ اور ان ہی کے ذریعہ اسلامی فکر و تمدن کا قافلہ آگے بڑھا ہے۔ اور اثر و نفوذ کی قوتیں بروئے کار آئی ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ کبھی حالات کے تقاضے نے کسی مخصوص سمت میں ایک قوت کا رجحان زیادہ کر دیا لیکن مجموعی طور پر یہ صلاحیتیں اسلامی تاریخ میں مختلف عنوان سے سرگرم عمل رہیں۔ ہندوستان کی تاریخ پر اس زاویہ سے نظر ڈالی جائے تو پانچ شخصیتوں کے اثرات دور رس نتائج کے حامل نظر آئیں گے — خواجہ معین الدین حسن سجزی اجمیری شیخ نظام الدین اولیاء شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت سید احمد شہید ان کے کارناموں کی حقیقت اور ان کی مساعی کا رخ کبھی بغیر ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کا جائزہ ممکن نہیں۔

خواجہ اجمیری اور حضرت محبوب الہی نے "عشق" کو رہبر بنایا اور شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی کے الفاظ میں "دل کی دکانیں" لگادیں جہاں جذب و شوق، سوز و مستی کا سودا ملتا تھا۔ خود ان کی زندگیوں میں اس حقیقت کی ترجمان بن گئیں۔

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ

عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

”صراط مستقیم“ کے باب اول میں جہن تائیر حُبّ عشق“ کا ذکر ہے، یہ وہی عشق حقیقی ہے جس نے ان بزرگوں کے دل کو گرمایا تھا۔ اسی کے ذریعہ انہوں نے اسلامی اثرات کا دائرہ وسیع کیا اور اسلام کی ”وحدت غیر“ قوت نے ہندوستان کے سماجی زندگی میں ایک انقلاب پر پا کر دیا۔ رقم الحروف نے

ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM میں ہندوستان میں اسلام پر اپنے مضمون میں اس کو دور تبلیغ و اشاعت اور اثر و نفوذ سے تعبیر کیا ہے۔ پھر ایک ایسا دور آیا جب خود اسلامی معاشرہ کی اصلاح، وقت کا سب سے بڑا تقاضا بن کر سامنے آئی۔ اور سرمایہ ملت کی نگہبانی کے احساس نے دلوں کو بے چین کر دیا۔ اب عشق سے زیادہ علم کی ضرورت تھی تاکہ علم کے ذریعہ آنے والی گمراہیوں کا سدّ باب کیا جاسکے۔ مجدد صاحب نے سیاکی اقتدار کے پورے عروج کے زمانہ میں اُن غلط نظریات کی تردید کو سختی سے روکا جو دربار سے نکل کر عوام کی زندگی پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ انہوں نے مذہبی فکر کو احداث و بدعات سے پاک کیا۔ عقائد کا فساد جن فکری گمراہیوں کے سہارے بڑھ رہا تھا، اس پر بند لگانے، پھر شاہ ولی اللہ نے سیاسی انحطاط اور فکری امتیاز کے زمانہ میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید کی طرف توجہ کی۔ اور جو نئی قوتیں اور نئے سماجی اور عمرانی نظریات ابھی کارگہ فکر میں تھے، ان سے نبرد آزما ہونے کا سامان مہیا کر دیا۔

حجۃ اللہ الباقی کا ایک ایک صفحہ پکارتا ہے ۷

حادثہ وہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینہ اور آراک میں ہے

پھر سید احمد شہیدؒ نے جب اپنی تحریک کا آغاز کیا تو حالات عمل اور چہرہ ساد کا مطالبہ کر رہے تھے، مجدد صاحبؒ نے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زمانہ میں ہم کی انتہا، شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دور انحطاط میں نئے نظام کی تصویر دکھائی تھی، لیکن عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ سید احمد شہیدؒ جب میدان میں داخل ہوئے تو حالات کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار تاریخ کے دھند لکوں میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ انگریز پورے سامراجی عزائم کے ساتھ اپنے اقتدار کو جمانے میں مصروف تھے۔ اسلامی شعائر پر اضمحلال کی جو کیفیت طاری تھی اس کا اندازہ صحرا پر مستقیم کے باب دوم کے مباحث سے لگایا جاسکتا ہے۔ عقیدہ توحید جس پر اسلامی سوسائٹی کے وجود کا انحصار تھا، غیر اسلامی تصورات میں الجھ کر رہ گیا تھا، اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ:-

تمدن، تصوف، شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی

مسئلہ صرف سیاسی اقتدار ہی کی واپسی کا نہیں تھا، بلکہ احداث و بدعات میں کھوئی ہوئی اُمت کی بازیافت کا تھا۔ اور اس کے لیے زندگی کے ہر شعبہ میں

مجاہدانہ جہد و سعی در کار تھی۔

سیاسی اقتدار نے دم توڑا تو معاشی حالت بھی بدل گئے۔ مسلمانوں کی زندگی سوز
 ”لا الّا“ سے محروم ہوئی تو خانقاہیں سیرت سازی کے کام سے نا آشنا ہو گئیں۔ اور
 مس سے اپنے مقصد و مہناج کو بھول گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بقول اقبال ۷

نہادِ زندگی میں ابتداً انتہا الّا

پیام موت ہے جب لا ہو الّا سے بیگانہ

وہ ملتِ روح جس کی لا سے بڑھ نہیں سکتی

یقین جانو ہوا بریز اس ملت کا پیمانہ

تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب بھی تاریخ ساز شخصیتوں نے اپنے کام کا آغاز
 کیا ہے، اپنے پیکر خاکی میں عزم اور ہمت کے سوتے اُبلتے ہوئے محسوس کئے ہیں۔
 ان کے دلوں میں اس اعتقاد اور یقین نے ایک جوش اور ولولہ پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ
 کی جانب سے اس کام کی انجام دہی پر مامور ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ تفسیحات میں
 لکھتے ہیں:-

”بہ سرم درد اندکہ ایس حقیقت بمر دم برساں۔ امر و وقت

وقت تست، وز مال زمان تو۔ وائے بر کے کہ زیر لولے تو نباشد“

حضرت سید شہید کے دل میں بھی یہ خیال ایک قوت عمل بن گیا تھا کہ قدرت
 ان سے خاص کام لینا چاہتی ہے۔ اور وہ اس کی انجام دہی پر متعین ہیں۔ ایک خط میں

دیکھتے ہیں:-

”فقیر دریں باب بشارتِ غیبی مامور است و بہ بشارتِ
لاریبی مُبَشَّر، ہرگز ہرگز شعبہ و سوسہ شیطانی و شائبہ ہوائے
نفسانی بایں اہامِ رحمانی مُتَسَرِّج نیست“

(خط ۳ ص ۳۰، برٹش میوزیم مخطوط)

اُس وقت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر اور حکمت کے تمام اجزائے ترکیبی
رائے بریلی میں جمع تھے اور سید احمد شہیدؒ ان کا علمی پیکر بن کر تاریخ کو یارخ دے رہے
تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا تو یہ خیال تھا کہ اگر شاہ ولی اللہؒ بھی اس وقت زندہ ہوتے
تو ان کو بھی حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ (خلیفہ و رفیق تربیت یافتہ) سید احمد شہیدؒ کے
جھنڈے کے نیچے جمع ہونا پڑتا۔ دیکھتے ہیں:-

”حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع و کامل
ہے؟ بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید و تدوینِ علوم و معارف اور
تعلیم و تربیت، اصحابِ استعداد تک محدود تھا۔ اس سے آگے نہ
بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہورِ شعوبہ کا پورا کام تو کسی دوسرے
ہی مرد میدان کا منتظر تھا۔ اور معلوم ہے کہ توفیق الہی نے یہ معاملہ
صرف حضرت علامہ و مجدد شہید رضی اللہ عنہ کے لئے مخصوص کر دیا
تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا۔۔۔۔۔

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو ان ہی کے مجتہد
 کے نیچے نظر آتے“ (متذکرہ ص ۲۷۰)
 پھر اصحاب ثلاثہ، یعنی شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب
 اور شاہ رفیع الدین صاحب کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:-

”حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند
 و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور
 شاہ رفیع الدینؒ علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر
 ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں
 ان کا فیضانِ علم کام نہ کر رہا ہو..... لیکن میدانِ دلائل و اساطیر
 کسی سے بھی بن نہ آیا۔ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک
 ہی جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پرچست آیا۔ دنیا اس کے خلعت
 عظمت اور تشریف قبول کا نہ ہے بڑے منظر کھڑی تھی“

مولانا آزاد کا یہ خیال بالکل صحیح ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو معاملہ کچھ اور
 آگے ہی نظر آئے گا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں سیکڑوں خاندان اور بے شمار
 حکمران اقتدار کے حامل بنے لیکن وہ گوشہ جہاں سید شہیدؒ نے اپنی تحریک کو منظم
 کرنے کے لیے اسلام کا سیاسی نظام نافذ کیا تھا، وہ اسلام کا حقیقی قدم تھا
 جو اس سرزمین پر رکھا گیا۔ ہندوستان کے کسی اور حصے میں اور تاریخ کے کسی اور دور

میں قرون اولیٰ کا نظام حیات اس طرح ایک زندہ حقیقت کے طور پر چشمِ عالم نے مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ارضِ الہند کا یہ تھوڑا سا ٹکڑا، زمان و مکان کی ساری بندشوں کو توڑ کر عہدِ صحابہ میں جا ملا ہے۔

سید احمد شہید نے سرحدی علاقہ میں جو حکومت کا نظام قائم کیا تھا اس کا مقصد اسلامی نظامِ حیات کا ایک نقشہ پیش کرنا تھا۔ انہوں نے عمل کیا تھا امام ابن تیمیہ کی اس ہدایت پر کہ بغیر امام مسلمانوں کی زندگی، غیر ملکی تسلط کے زمانہ میں منظم نہیں ہو سکتی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”قیامِ دین بملک است، واحکامِ دینیہ کہ تعلق بحکومت دارند،

بوقت نبودن مملکت صاف از دست می روندند۔
 ان کی نظر آفاقی تھی، ان کا مصلحِ نظریہ تھا:-

”اس قدر آرزو دارم کہ در اکثر افراد بنی آدم بلکہ جمیع اقطار عالم احکام حضرت رب العالمین کہ مسئلی بشرع متین است بلا منازعت احد نافذ گردد۔“

پہلے دعوت اور اس کے بعد عزیمت اور عمل سنتِ نبوی ہے۔ جب کسی تحریک کا آغاز ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی فکری اساس مضبوط کی جاتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں آیاتِ مکی کے ذریعہ تمام انسانیت کو مخاطب کر کے اپنا پیغام پہنچا دیا۔ پھر مدینہ منورہ میں ان اصولوں کو زندہ حقیقت بنا کر پیش کیا اور

خطاب مومنین سے کیا کہ اُن پر اس نظام کو چلانے کی ذمہ داری تھی۔

سید احمد شہیدؒ نے اپنی زندگی کے کئی سال ذہنی فضا کے تیار کرنے میں صرف کئے اور پھر جہاد کی تیاری میں لگ گئے۔ اور ہلاخراشد کے اس فرمانبردار بندے نے اپنی زندگی اس کی راہ میں اس طرح قربان کر دی کہ فضائیں تک پکار اٹھیں سے

ظہور عشق حقیقت طراز تھا ورنہ

یہ دل کشی کہیں دارورسن میں آئی ہے

سید احمد شہیدؒ نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی حیات اجتماعی کو سب سے بڑا صدمہ بیرونی

اقتدار سے پہنچا ہے چنانچہ انھوں نے ملک کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلانا اپنے جہاد کے مقاصد میں شامل کیا۔ گوالیار کے ہندوراؤ اور جہڑال کے شاہ سلیمان کے نام ان کے خطوط، ان کے مقاصد کے بہترین آئینہ دار ہیں۔ ہندوراؤ کو لکھتے ہیں:-

”برائے سامی روشن دُشمن ہن است کہ بیگانگان بعید الوطن

ملوک زمین و زمین گردیدہ و تاجران متاع فردشس بیایہ سلطنت

رسیدہ، امارت امرائے کبار دریاست روسائے عالی مقدار

برباد نمودہ اند و عزت و اعتبار ایشان بالکل ربودہ۔ چوں اہل

ریاست و سیاست در زادیہ نغمول نشستہ اند، ناچار چندے

اہل فقر و مسکنت کمر ہمت بستہ این جماعت صنعاء محض بنا

بر خدمت دین رب العالمین برجستند“

ہندو راجہ سے یہ کہنا کہ ”دین رب العالمین“ کی خدمت کا جذبہ میدان میں لایا ہے، بے حد اہم ہے۔ غلام حیدر خاں کے نام مکتوب میں بھی انہوں نے اس ”جو رو ظلم“ کا ذکر کیا ہے جو انگریزوں نے ملک پر ڈھائے تھے۔ ان کی آواز میں اللہ نے غضب کی تاثیر دی تھی، جس کو سن کر نہ صرف دل سینوں میں تڑپنے لگتے تھے بلکہ سر جسم پر بوجھ بن جاتا تھا اور ذوق شہادت میں لب پر دعا آجاتی تھی۔

الہی مجھے بھی شہادت نصیب

یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

ہندوستان کی تاریخ میں جان قربان کرنے کے لیے ایسا جذبہ پھر بھی نظر

نہیں آیا۔ جب درودیوار سے یہ صدائیں آتی تھیں۔

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا

فدا جہا سے راہِ خدا میں ہوا

حبیبِ حبیبِ خداوند ہے

خداوند اس سے رضامند ہے

امامِ زمانہ کی یاری کرو !

خدا کے لئے جاں نثاری کرو

(مومن)

مائیں، لوریوں میں اپنے بچوں کے لئے شہادت کی دعائیں مانگنے لگیں۔

انسانی جذبات کا یہ تلامذہ اسلامی ہند کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ امر وہم کے

مومن شدہ ہم زبان عرفی الہیہ آماں آفرینش
 برنیز کہ شور کھنسر برفاست
 ایے فتنہ نشان آفرینش
 یہی انداز مولانا محمد امین غازی کا تھا۔ لکھتے ہیں :-

زبد دینی حاکمانِ زمن
 نشان حیا نیست در مرد و زن
 زبد دینی حاکمانِ زمن
 حیا روئے پوشیدہ رفت از جہاں
 بجاں آدمیم از تعدی شاں
 بے الاماں المدد الاماں

مولانا خرم علی بلہوری نے قصیدہ جہاد یہ لکھا جو اتنا پُر تاثیر تھا کہ مجاہدین
 لڑائی کے وقت اس کو پڑھتے تھے اور بے خود ہو جاتے تھے۔

حضرت سید احمد شہید نے گلت سے لے کر بالاکوٹ تک جہاد کا جذبہ پیدا کر دیا
 تھا۔ ان کی نگاہ کی یہ تاثیر تھی کہ جس کی طرف دیکھ لیا وہ دار و رسن کی تمنا میں اپنے روز و شب
 بسر کرنے لگا۔ اسلامی ہند کی تاریخ میں کوئی اسلامی تحریک ایسی نمودار نہیں ہوئی تھی
 جس کا دائرہ اثر و نفوذ اتنا وسیع ہو اور جس نے ہر چھوٹے بڑے کے دل کو جذبہ جہاد
 سے گرمایا ہو۔ سرسید کا بیان ہے :-

”شہر کلکتہ میں جب تک آپ نے تشریف رکھی، شراب مطلق نہ بننے پائی۔ اور کلال خانہ بند رہا اور اس نواح میں آپ کے مریدوں کی تعداد لکھوک سے گزر گئی“ (آثار الصنادید)

وہ کلکتہ میں ساڑھے تین یا پونے چار مہینے ٹھہرے تھے۔ پرنسپ (PRINCEP) کے بیان کے مطابق کلکتہ کے باشندوں کی بڑی تعداد اس زمانہ میں ان کی پیروی ہو گئی تھی بقول حسن۔

تیری تائید سے اک خصلت ہوئی ہے تاب

تیری تبنیہ سے لاکھوں ہونے فاسق اطہر

روسی معنیف جو ہر تحریک میں مزدور اور کاریگر طبقوں کی شرکت سے اس کی اہمیت اور دائرہ اثر و نفوذ کا اندازہ کرتے ہیں، اس تحریک کے عوامی رنگ سے متاثر ہیں۔

EN. KAMAROV کا خیال ہے کہ تحریک نے Lower urban stratum نچلے شہری طبقے کو خاص طور پر متاثر کیا تھا۔ لکھتا ہے:-

Its main force were the popular masses

(NEW THOUGHT, FEB. 1, 1958)

اس نے ایک برطانوی افسر کی رپورٹ کا ذکر کیا ہے جس میں اس نے اعظم گڑھ کے نوربانوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سید شہید کی تحریک سے متاثر ہو کر آمادہ بغاوت ہو گئے ہیں۔

جن حلقوں سے سید شہید پر اعتراض کئے گئے ہیں ان کی آنکھیں جذبات کے اس طوفان کا ساحل سے بھی نظارہ نہ کر سکیں جو انہوں نے ہمالیہ کی چوٹیوں سے نکل کر خلیج بنگال کے کناروں تک پیدا کر دیا تھا۔

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی

اے پیر حرم تیری مناجاتِ محسوس کیا

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی ساری مذہبی سیاسی اور اصلاحی تحریکیں سید شہید کے گرد جمع ہو گئی تھیں اور اسلامی ہند کا مرکز ثقل ان کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ خاندان ولی اللہی تو ان کے گرد جمع تھا ہی، پیو سلطان کے خاندان کے وہ افراد جو اپنی حریت پسندانہ سرگرمیوں کے باعث دیپور کی سرکشی کے بعد کلکتہ منتقل کر دیے گئے تھے، حضرت شہید کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے۔ دکن میں نواب مبارز الدولہ نے سید شہید کے نمائندوں سے رابطہ اور تعلق پیدا کیا، بنگال میں فرائضی تحریک نے مجاہدین کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ میرزا علی عرف تیتو نے حضرت شہید کے دامن میں پناہ لی۔ انہوں نے ۱۸۳۱ء میں نرکل بریاس میں بانسوں کی ایک مضبوط فصیل بنائی اور ایٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ تعجب خیز واقعہ ہے کہ بالاکوٹ اور نرکل بریا، دونوں مقامات پر۔۔۔ جن کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔۔۔ شہادت کے میدان ایک ہی وقت میں گرم ہوئے اور مجاہدین کے قافلہ سالار حضرت سید احمد نے بالاکوٹ کے میدان میں جام شہادت پیا، ادھر بنگال میں نرکل بریا

کے میدان میں مجاہدین کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ جو مجاہدین پنج گئے وہ علی پور جیل پہنچا دیے گئے اور بس۔

پھر نہ کچھ دیکھا، بجز یک شعلہ پر بیچ و تاب
شیخ تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروا نہ گیا!

حضرت شہید کے مکتوبات اُن کی تحریک جہاد کے مقاصد، اُن کے طریقہ کار اور اُن کے نظام حکومت کے بنیادی اصول سمجھنے میں بے حد معاون ہیں۔ یہاں چند اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی جاسکتی ہے:-

۱) انہوں نے بار بار اس کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے محض اللہ کی خاطر جہاد کا قدم اٹھایا ہے۔ حکومت و اقتدار، مال و دولت ان کا مقصود و مطلوب نہیں اقبال کا یہ شعر ان کے مقاصد کا بہترین ترجمان ہے:-

شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن
نہ مالِ غنیمت ، نہ کشور کشائی

اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ اپنے بنیادی مذہبی افکار کو ایک صالح نظام حکومت کی شکل دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس نظام کے بغیر وہ توحید کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر پیش نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے کابل، ہرات، بخارا وغیرہ کے حکمرانوں کو اپنی تحریک کے مقاصد سے واقف کرانے کے لیے خطوط لکھے تھے۔ جن سے ان کے دینی مقاصد پر روشنی پڑتی ہے۔ شاہ سلیمان والی پیراہل کے نام خط میں انہوں نے ۱) حکومت کے

نصاری کے ہاتھ میں پہنچ جانے، (۲) غلبہ شرک و کفر اور (۳) شعارِ اسلام کے خاتمہ پر اپنے دل کی بے چینیاں کا اظہار کیا ہے۔ اور یہی تین مقاصد ان کی تحریک کے تھے۔

(۲) علاقہ بالا کوٹ کا انتخاب کرنے سے پہلے انھوں نے ”ہندو سندھ و خراسان“ کے سب اہم مقامات کا سفر کیا تھا اور تحریک کا BASE OF OPERATINO بنانے کی نظر سے جائزہ لیا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”در بلاد ہندو سندھ و خراسان دور و سیر نمودیم در تمامی آئین حیات
کوہ و دشت فقط طالب خیر بودیم۔ آخر لام در مثل این بلاد دور و ست
گردیدہ و تمامی این کوہ و دشت نور دیدہ را اوطان یوسف زئی رسیدیم“
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم ص ۲۰)

”شوق ہجرت“، ”غیرت ایمانی“ اور ”جو شش اقامت جہاد“ کی خاطر وہ علاقہ
بالا کوٹ میں پہنچے تھے اور یہاں پہنچ کر انھوں نے محسوس کیا ہے
ایک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منہ زلِ جاناں کے قریب
اس زمین کے لیے مشیتِ ایزدی نے یہ شرف و افتخار مقدر کیا تھا کہ یہاں
عشقِ الہی سے سرشار ایک قافلہ اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرنے کے لیے
پہنچے گا۔

لیکن بالا کوٹ کو مرکز بنانے کا فیصلہ جذباتی نہیں تھا۔ یہ حقائق کی روشنی میں

مصالح کے پیش نظر تھا جس کا اندازہ مکتوبات سے ہوتا ہے۔
 (۳) مجموعہ مکتوبات میں بعض "امان نامے" بھی نقل کئے گئے ہیں۔ ان سے مقاصد اور وسیع حلقہ اثر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک "امان نامہ" سوہبا اور تلسی کے نام اس مضمون کا ہے:-

"امان نامہ بنام سوہبا و تلسی و گنگو و سوہبا مع پسران بشرط
 بجا آوری خدمت لشکر"

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم ص ۲۶۶)

۲۷۸

پھر ایک مسلمان کے لئے "امان نامہ" کا مضمون ہے:-

۹۶۹

"سلام الدین و فقیر محمد و عباس از اولاد میاں مصری بشرط اتباع
 شرع و ادائے زکوٰۃ وغیرہ حقوق اللہ"
 (قلمی نسخہ ص ۲۶۶)

ان دو "امان ناموں" میں اسلامی نظام حکومت کی پوری جھلک نظر
 آتی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ انہوں نے ہندوؤں سے تعلقات نہایت خوشگوار
 رکھے۔ اسمتھ (W.C. SMITH) نے تحریک کے سیاسی پہلوؤں پر غور کرنے کے
 بعد لکھا ہے کہ اس کا کوئی رخ ہندوؤں کے خلاف نہیں تھا۔

None of these political activities however was anti-hindu

”ان کی سیاسی سرگرمیوں میں کوئی بات ہندوؤں کے خلاف نہیں تھی“
 تحریک کاسکھوں کے خلاف ہونا بھی اب تاریخ سے ثابت نہیں۔ یہ صحیح
 ہے کہ جو طاقت بھی راہ میں حائل نظر آئی اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہو گیا، لیکن بنیادی
 طور پر تحریک کا مقصد سکھوں سے نبرد آزمانی نہیں تھی۔ مکتوبات میں جس طرح ”نصاریا“
 کو ہیدہ خیال کی جگہ ”سکھان نکو ہیدہ خصمال“ اور ”کفار فرنگ بر ہندستان تسلط
 افتمہ“ کو ”کفار دراز مویان کہ بر ملک پنجاب تسلط یافتہ“ میں تبدیل کیا گیا ہے
 یہ تاریخ کی انتہائی ستر مناک جعل سازی ہے۔ لیکن اس کا تجزیہ کرتے وقت غیر منگی
 فتنہ کے ان مظالم پر نظر ہونی ضروری ہے جن سے مجبور ہو کر یہ تحریکیں کی گئی تھیں۔
 (۴) مکتوبات سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ جنگ و جدال کا فائرہ
 فتنہ رکھنا چاہتے تھے۔ اپنے صلح اور امن کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے، لالہ رام سنگھ
 و جنگ بالا کوٹ سے دو سال قبل (۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء کو) لکھتے ہیں:-
 ”من بندہ پروردگارم۔ ہر کس کہ پیغام صلح فرستد از طرف خود
 جنگ پیش نمی کنم“
 ظاہر بین نگاہوں کو شاید ۱۸۳۱ء میں تحریک جہاد کا خاتمہ نظر آئے، لیکن
 حقیقت یہ ہے کہ

جلے، جل کر بجھے بھی چشم صورت میں میں پروانے

فروزاں کر گئے وہ نام لیکن شمع سوزاں کا !

وقتی طور پر ان کو ناکامی ضرور ہوئی لیکن ان کی تحریک نے سرفروشی کا جو جذبہ

پیدا کر دیا تھا وہ ایک عرصہ تک قلب و جگر میں شعلہ کی طرح بھڑکتا رہا اور بقول اقبال

ظ ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم

سر سید کا بیان ہے کہ سید شہید کے چودہ پندرہ سال بعد تک مجاہدین جہاد

کے جذبہ سے سرشار سرحدی علاقوں میں "بیت جہاد" پہنچتے رہے۔

انگریزوں نے مجاہدین کے ساتھ جو ظالمانہ برتاؤ کیا اور ان کی بیخ و بن اکھاڑ

پھینکنے کی کوشش کی، وہ تاریخ بھلا نہیں سکتی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے جن

علماء و مجاہدین کو خاص طور پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ان میں خاصی تعداد مجاہدین کے

گھرانوں کی تھی۔ ۱۸۶۴ء کے ایشالہ بغاوت مقدمہ، ۱۸۶۵ء کے پہلے مقدمہ بغاوت

پٹنہ، ۱۸۶۵ء کے مالوہ بغاوت کیس اور راج محل بغاوت مقدمہ اور ۱۸۶۷ء کے دوسرے پٹنہ

بغاوت کیس میں مجاہدین کے خاندان جس طرح برطانوی مظالم کا شکار بنے ان کی داستان

دروناک ہے۔ "الدّر المنثور" میں مولانا عبدالرحیم نے اپنے چچا مولانا ولایت علی عظیم آبادی اہ

دیگر مجاہدین کے حالات لکھے ہیں۔ ۱۸۶۵ء میں عید کے دن ان کے مکانوں کو جس طرح مسامر

کیا گی، اُس کا حال مولانا عبدالحمید نے ایک مثنوی میں لکھا ہے:-

چوں شب عید را سحر کردند

ہمہ را از مکاں بدر کردند !
 ضبط و تاراج جملہ مال و متاع
 اشتر و فیصل و گاہ و اشتر و اسپ
 باغ را و منازل دل چسپ
 آں بنا ہائے شایخ و محکم
 کہ بہ گیتی بود عدیش کم !
 اندراں خانہ طالبان چوں بخوم
 روز و شب مشغول بہ درس علوم
 جملہ دیوار و سقف و خانہ و در
 بیل زن کردہ منہدم یکسر

ہندوستان میں جنگ آزادی کی تاریخ سید شہید سے شروع ہوتی ہے۔
 انھوں نے اپنے خون سے آزادی کے جس پودے کی آبیاری کی تھی، وہ ایک ایسے وقت میں
 برگ و بار لایا جب کوتاہ بین نظریں ان گذرگاہوں کو بھول چکی تھیں جہاں سے حریت
 اور آزادی کے ان علم برداروں کا قافلہ گزرا تھا۔

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ جنگ
 آزادی سید شہید کی عظیم الشان تحریک کا صرف ایک پہلو ہے۔ بعض اوقات ہم کسی
 ایک پہلو پر اس طرح سے نظر میں مرکوز کر دیتے ہیں کہ تحریک کی مجموعی حیثیت اور اس کے

مقصد و منہاج کے متعلق محدود تصورات نشوونما پا جاتے ہیں۔ سید شہید جس مقصد کے لیے میدان عمل میں داخل ہوئے تھے وہ عقیدہ توحید کو مسلمانوں کی حیات آتماگ میں ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے بیدار کرنا تھا۔ وہ یہ احساس پیدا کرنا چاہتے تھے کہ

ہے زندہ وحدتِ انکار سے ملت

وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو

آئی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خدا داد

عقیدہ توحید سے جو نظام وجود میں آتا ہے اس میں انسانیت کے لیے فوز و صلاح کا پیغام ہے۔ "تقویت الایمان" میں توحید کو زندگی کے ہر شعبہ میں ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے دیکھنے اور بدعات سے اس تصور کو پاک کرنے کی کوشش براہ راست دل پر اثر کرتی ہے اور یہ احساس شدید ہو جاتا ہے کہ

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی

آج کیا ہے؟ فقط اک مسلم کلام

سید شہید کی تحریک جہاد کو اسلام کی تاریخ کے وسیع چوکے میں سمجھنے اور پیش

کرنے کی ضرورت ہے۔

تعجب ہے کہ اس تحریک کے فکری اثرات کا جائزہ پورے طور پر نہیں لیا گیا

بعض معاصرین نے جو سید شہید کے خلوص، جذبہ اور جدوجہد سے بے حد متاثر

سیاسی حالات کے پیش نظر بعض پہلوؤں کو دبا کر پیش کیا۔ سرسید نے انگریزوں کے انتقامی جذبے سے بچانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ بعض حلقوں میں ان کی تحریک جہاد کو تو نظر انداز کر دیا گیا، ان کی خانقہوں کی تنقید کی نشاۃ ہدف بنایا گیا۔ ضرورت ہے کہ تحریک کے اثرات کا جائزہ وسیع پس منظر میں لیا جائے۔

سرسید، ان کے معاصر تھے۔ جب آثار الصنادید لکھنے بیٹھے تو ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵ سال سید احمد شہید اور مولانا محمد اسماعیل کی شہادت کے ہو چکے تھے، لیکن جب ان کا حال لکھا تو ان کا قلم وجد کرنے لگا۔ ان کے حرفِ حرف سے عقیدت اور محبت کا جذبہ نپکتا تھا۔ سرسید کو تقلید سے آزادی ان ہی کی تحریک سے ملی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مولانا محمد اسماعیل شہید کا پیرو بتاتے تھے اور تقویت الایمان کے متعلق کہتے تھے کہ یہ محبت الہی، میں لکھی گئی ہے (خطوط ص ۳۷) انہوں نے ایک رسالہ راہ سنت و رو بدعت لکھا تھا جس میں یہ اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ حالی نے حیات جاوید میں لکھا ہے،

”مولانا اسماعیل شہید کی تصانیف نے ان کے خیالات کو اور زیادہ

اصلاح کی“ (حیات جاوید ص ۳۰۴)

اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی اذیت ہی اصلاح کی تاریخ مولانا سید احمد شہید سے شروع ہوتی ہے۔ بعد کو سرسید نے ان کی تقلید میں قدم آگے بڑھایا لیکن ان کے حالات اور مسائل اور تھے، اس لیے ان کی تحریک دو سر ارض اختیار گئی۔

پھر حالی بھی سید شہید اور خاندانِ ولی اللہ کی مذہبی سرگرمیوں سے متاثر ہوئے

بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے ایک زمانہ میں نواب صدیق حسن خاں کی تائید میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ ایک بار غالب کو نماز کی پابندی نہ کرنے پر مذہب اور احتسابی انداز میں متوجہ کیا تھا۔ اُن کی ”یوہ کی مناجات“ سید شہید اور مولانا اسماعیل شہید کی تحریک نکاح بیوگان کی مدلے باز گشت ہے۔ وہ سوشل ریفرم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”مسلمانوں میں ظاہر اور شخصیتوں کے سوا کہ دونوں دلی کی خاک سے اٹھے، کسی نے سوشل ریفرم پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک مولانا اسماعیل،

دوسرے سید احمد خاں“ (حیات جاوید ص ۶۴۱)

سرسید مولانا اسماعیل کی حق گوئی کے قائل تھے اور یہ ایک ایسا وصف تھا جس کی اپنے عہد کے علماء میں کمی پاتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”میں بڑھا ہوں اور اپنی عمر میں ہر فرقہ کے بہت بڑے بڑے شخصوں

کو دیکھا ہے۔ اس چیز نے اور اسی خیال نے کلمۃ الحق کے کہنے سے

ان کو باز رکھا۔ مولانا اسماعیل شہید اگر اس قسم کے خیالات میں مبتلا

رہتے تو ہندوستان میں شرک و بدعت کی تاریکی کیسے دور ہوتی“

(خطوط ص ۱۶۹)

بعد کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد، سید شہید کی تحریک جہاد کے زبردست معترف تھے۔ انھوں نے مولانا عبدالرحیم کی ”الدر المنثور“ پر اپنی نوجوانی میں مقدمہ لکھا تھا۔ اُن کے استاذ مولانا محمد یوسف رنجور کے باپ مولانا محمد کئی علی تحریک مجاہدین

کے زبردست مبلغ تھے۔ اُن کی ساری جائیداد ضبط کر لی گئی اور اُن کو انڈمان بھیج دیا گیا۔ وہاں سے انھوں نے اپنی اہلیہ کو خط لکھا کہ خدا کا شکر ہے کہ تم کو اس آزمائش کے لیے منتخب کیا گیا یہ جذبہ جان پارسی سید شہید کی سرکردگی میں ہر مجاہد کے دل کو گرمائے ہوئے تھا۔ مولانا آزاد کے دورِ نیک۔۔۔ اجمل خاں اور ہمایوں کبیر۔۔۔ مجاہدین کے خاندان سے تھے۔ مولانا آزاد نے ”تذکرہ“ میں جس طرح سید شہید کی تحریک کو اسلام کی تاریخِ عزیمت میں جگہ دی ہے، وہ اُن کی فکر کے بنیادی خطوط کو روشن کرتی ہے ایک ایک لفظ سے عقیدت کا جذبہ اور اتباع کا جوش ٹپکتا ہے، وہ حال اپنا لکھ رہے تھے، لیکن سید شہید نے اُن کی شخصیت پر جو اثر ڈالا تھا، اس کے پیش نظر وہ اُن کو بھلا نہ سکتے تھے۔ ایک بار خاکسار سے گفتگو میں فرمانے لگے: میرے والد کی ولادت ۱۸۳۱ء میں ہوئی تھی، اس سال جب جنگِ بالاکوٹ لڑی گئی تھی۔ اتنا جملہ کہہ کر انھوں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ وہ ماضی کے گریز پرانظاروں کو اپنے تصور میں مقید کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب آنکھیں کھولیں اُن میں ایک خاص چمک تھی۔ اُن کے باپ اگر جنگِ بالاکوٹ کے سال میں پیدا ہوئے تھے، تو انھوں نے اپنی زندگی اس مسلک اور ان مجاہدانہ سرگرمیوں کی تائید میں صرف کر دی جو سید شہید کی جہدِ سوسی کا مرکز و محور تھا۔ ضرورت ہے کہ مذہبی، ادبی، سماجی سیاسی سب میدانوں میں سید شہید کی تحریک کے عمل اور ردِ عمل کا تجزیہ کیا جائے۔ سر سید، حالی، آزاد اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں ممتاز تھے، لیکن

تینوں سید شہید کی تحریک سے متاثر تھے۔ ہنٹر (HUNTER) کے بیانات کہتے ہی متعصبانہ ہوں، لیکن اُن سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سید شہید کے اثرات کا دائرہ کتنا وسیع تھا اور حکومت ان سے کتنی خائف تھی۔ جب ۱۸۹۲ء میں واقعہ بالاکوٹ کا دورہ کیا تو اُن کو سید شہید کے خاندان کے چشم و چراغ کی حیثیت سے سراور انکھوں بٹھایا گیا۔ مولانا ذوالفقار علی نے ان کو بتایا تھا کہ سید صاحب جن جن قصبات میں تشریف لے گئے وہاں اب تک خیر و برکت کا ماحول ہے ”گویا ایک نور مستطیل ہے کہ جدھر گئے اُدھر وہ پھیل گیا“

سید صاحب کے معاذین نے اُن کی بابت جو کچھ لکھا ہے وہ تعصب اور تنگ دلی پر مبنی ہے مستشرقین اگر ایک طرف سیاسی مصلحتوں سے مجبور تھے تو دوسری طرف اُن کی محرومی یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی دینی، ملی اور فکری تحریکوں کا خاموش اشاروں کو سمجھنے سے معذور تھے۔ وہ رائے بریلی کو ایک غیر معروف قصبہ اور سید شہید کو ایک غیر معروف خاندان کا فرد، اور بعض قزاقوں کے قبیلے سے متعلق سمجھتے رہے۔ حالانکہ رائے بریلی میں اس وقت اسلامی ہند کا دل دھڑکتا تھا اور سید احمد شہید سادات حسن کے چشم و چراغ تھے۔ وہیل سے حکمت ولی اللہی کا چشمہ رائے بریلی پہنچ چکا تھا اور ایک دو سفر کی تیاری میں مصروف تھا۔ لیکن

لے دہلی اور اس کے اطراف از مولانا حکیم سید عبدالحی ص ۱۱۳۔ ۱۱۵

ان کی نگاہیں ان حقائق کا جواز نہ دے سکیں۔ O Caroe 'Hardy' 'Hughes' وغیرہ کے بیانات تعصب اور جہالت پر مبنی ہیں۔ لیکن وہ اگر سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک کے حقیقی ضد و خال کو نہ دیکھ سکے تو چشمہ آفتاب را چہ گناہ۔

بعض مسلمان مصنفین نے جس طرح سید شہیدؒ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان پر بے بنیاد اعتراضات عاید کئے ہیں، ان کا جواب محرم المقام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" میں جس بصیرت افزا انداز میں دیا ہے اس پر اضافہ ممکن نہیں۔

سید شہیدؒ کا عقیدہ تھا کہ

ازاں کشتِ خرابے حاصلے نیست

کہ آب از خونِ شبتیرے ندارد !

چنانچہ انھوں نے خدا بلند کیا،

نکل کر خافقا ہوں سے ادا کہ ہم شبتیری !

اللہ نے اُن کو رسمِ شبتیری پورا کرنے کی سعادت بخشی۔ جنھیں یہ سعادت میسر نہ آسکی انھوں نے اپنی گردنیں عظمتِ گذشتہ کے ریگ زار میں چھپالیں اور وقت کی یہ بھار اُن کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علم لاہوتی !!

حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جنہوں نے آنکھیں کھلی رکھیں وہ بھی اس علمبردار توحید کے مقاصد کو نہ سمجھ

سکے، کیونکہ وہ بدعات و احداث کی دنیا میں گم تھے۔ بقول اقبال

بیابان میں نکتہ توحید آتو سکتا ہے

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے!

جو خود صنم خانہ بن چکے تھے، ان تک یہ صدا کیسے پہنچ سکتی تھی۔ انہوں نے
رسم و رہ خانقاہی کا ناقہ دانہ جاڑ لیا، نہ ان کی نوائے سحری کا مقصود سمجھا۔ سید شہید تصوف
کو "احسان" کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ ان کو اس کا مخالف بنا کر پیش کرنا حقائق سے
چشم پوشی ہے۔ صراط مستقیم کے آخری ابواب میں تصوف کی گمراہیوں کی اصلاح ہے
اور "احسان" کو رہبر بنایا گیا ہے۔ "راہ نبوت" کا انہوں نے جس طرح تجزیہ کیا ہے وہ ان کو
فکر کی بنیادی حقیقتوں کو واضح کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں تعقیقات کا عقبہ ۲۴ جس میں
"خوش اعتقادوں کی توحید پر گفتگو کی ہے، لائق مطالعہ ہے۔

بعض معترضین نے سرحدی علاقے کو تحریک کامرکز بنانے پر اعتراض کیا
ہے۔ ان کو سرملٹن گب کا وہ جواب پیش نظر رکھنا چاہیے جو اس نے محمد بن عبدالوہاب
کے سلسلہ میں دیا ہے:

“.....He had selected as the nucleus of his movement a region which was out of reach of an organised political authority, where there was therefore, an open field for the propagation of his teachings and where, if he were successful, he might be able to build up a strong theocratic organization by the aid of warlike tribesmen.”

(Modern Trends In Islam p. 26)

” انھوں نے اپنی تحریک کے مرکز کے لیے ایک ایسے خطہ کا انتخاب کیا جو کسی مضبوط سیاسی قوت کی دسترس سے باہر ہو اور جہاں وہ اپنی تعلیمات کو پھیلا سکیں اور کامیابی کی صورت میں ایک مضبوط مذہبی تنظیم بنانے کا بیجوں کی مدد سے قائم کر سکیں۔“

بعض مصنفین نے تحریک مجاہدین کو محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کا چربہ اور اس

سے کئی طور پر متاثر بتایا ہے۔ یہ خیال بھی اصلاح طلب ہے۔ سید شہید حجاز قیام کے زمانہ میں نجد کی تحریک سے واقف ضرور ہوئے اور تنظیمی اعتبار سے ممکن ہے بعض چیزیں قبول بھی کی ہوں، لیکن تحریک کی سمت اس کا مقصد و مہاج، اس کا طریقہ کار، اس کی فکری اساس ان کی اپنی تھی۔ میں نے ایک مضمون میں جو اسلامک کلچر میں شائع ہوا ہے (جولائی ۱۹۸۱ء) اس پہلو پر مختصر گفتگو کی ہے۔

بعض معاندین نے حق و صداقت کا دامن اس طرح ہاتھ سے چھوڑ دیا کہ حضرت

سید شہید پر خود غرضی اور تنگ نظری کے الزام گھلانے لگے۔ انہوں نے صحیح تصویر
پیش کرنے کا دعویٰ کیا اور حقیقت کو مسخ کر دیا۔ ان سے تو حالی کا صرف یہ شعر کہا
جا سکتا ہے۔

انہوں نے خود غرضی شکلیں کبھی دیکھی نہیں شاید

وہ جب آئینہ دیکھیں گے تو ہم دکھلائیں گے ان کو

بعض معاندین نے عمداً ان کے جنگ آزادی کے عزائم کو غلط پیش کیا، گو
بالاکوٹ کی فضائیں پکارتی رہیں۔

مرا چھپیں بد آموز چسپن خواند

کہ داوم چشم ز گس را نگا ہے

حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی جدوجہد میں سید شہید کے کارنامے کبھی

فراموش نہیں کئے جاسکتے۔

• بنا کر دند خوشش رسے خون و خاک غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

—————